علامہ اقبال

ترجمہ: ڈاکٹر حامد خان حامد

اسلام کا اخلاقی اور سیاسی مطمحِ نظر

یہ علامہ اقبال کے ایک پرانے انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ ہے جو ڈاکٹر حامد خان حامد نے کیا ہے۔ اس کو تاریخ کے ایک حصّے کی حیثیت حاصل ہے۔

تین نقطہ ہائے نظر ہیں جن سے کسی مذہبی نظام کا جائزہ لیا جا سکتا ہے: معلّم کا نقطۂ نظر، مفسّر کا نقطۂ نظر اور منتقد طالب علم کا نقطۂ نظر۔ میں معلّم ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا جس کے افکار و اعمال ان مطمح ہائے نظر کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہوتے ہیں یا ہونے چاہئیں، جو وہ دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے، وہ اپنے سامعین کو حکم کی نسبت مثال سے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ میں مفسر ہونے کا ادّعا بھی نہیں کرتا جو اپنے کام میں نازک، باریک اور دقیق تعقّل سے استفادہ کرتا ہے، جو ان اصولوں کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے، جن کی وہ تعبیر کرنی چاہتا ہے، اور جو خاص پیش فرضیات کے ساتھ اس صداقت کے متعلق کام کرتا ہے جس کے بارے میں وہ کبھی کوئی سوال نہیں کرتا۔ وہ ذہنی رویہ جو منتقد طالب علم کو مشخص کرتا ہے، بنیادی طور پر معلّم اور مفسر کے رویے سے مختلف ہے، وہ مطلوبہ موضوع کا جائزہ تمام پیش فرضیات سے بے نیاز ہو کر لیتا ہے، اور مذہبی نظام کی عضوی ساخت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، بعینہٖ جیسے ایک ماہر نباتیات زندگی کی ایک صورت کا اور ایک ماہر عضویات دھات کے ایک ٹکڑے یا حیوانی جسم کے کسی حصّے کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کا مقصد علمی اور سائنسی تحقیق کے طریقوں کو مذہب پر منطبق کرنا ہوتا ہے۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کس طرح مختلف عناصر ایک دیے ہوئے ڈھانچے میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑتے یا گتھم گتھا ہوتے ہیں، کس طرح مختلف اجزا یا عناصر انفرادی طور پر کام کرتے ہیں، اور کس طرح ان کا باہمی تعلق کل کی افادی ارزش کو متعین کرتا ہے۔ وہ موضوع کو تاریخ کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور اس نظام کی تشکیل، نشو و نما اور اصل کے متعلق، جس کو وہ دیکھنا چاہتا ہے، خاص بنیادی سوالات اٹھاتا ہے۔ مثلاً وہ کون سی تاریخی قوتیں ہیں، جن کے تجربے [illegible] کے طور پر ایک مخصوص نظام کی

مظہریت کو جنم دیا؟ کیوں ایک مخصوص مذہبی نظام، مخصوص قوم یا افراد کے ذریعے پیش ہونا چاہیے؟ اس قوم کی تاریخ میں ایک مذہبی نظام کی حقیقی اہمیت کیا ہے جس نے اس کو پیش کیا اور نوعِ انسانی کی تاریخ میں مجموعی طور پر اس کا کیا مقام ہے؟ کیا کچھ ایسی جغرافیائی علل موجود ہیں جن سے ایک مذہب کے اصلی محل وقوع کا تعین ہوتا ہے؟ کہاں تک مذہب ایک قوم کی باطنی روح کی ترجمانی کرتا ہے اور کہاں تک اس سے قوم کے مختلف افراد کے اجتماعی، اخلاقی اور سیاسی جذبات و احساسات کی عکاسی ہوتی ہے؟ مذہب سے افرادِ قوم کی اگر کوئی قلبِ ماہیت ہوتی ہے تو کس قوم کی ہوتی ہے؟ انسان کی تاریخ میں جس بنیادی مقصد کا اظہار کیا گیا ہے اس کے حصول میں مذہب کہاں تک ممد و معاون ثابت ہوا ہے؟ یہ ہیں چند سوالات۔ مذہب کا منتقد طالب علم ان کے جوابات دینے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ان جوابات کے ذریعے مذہب کے ڈھانچے کو سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ تاریخی ارتقا کی قوتوں میں مذہب کی اس حیثیت کی بنیادی قدر و قیمت کا صحیح طور پر تخمینہ لگاتا ہے کہ وہ ایک مہذب واسطہ یا ایجنسی ہے۔

میں اسلام کو منتقد طالب علم کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہتا ہوں، لیکن میں شروع ہی میں یہ بیان کر دوں کہ میں ان تعبیرات اور اظہارات سے اجتناب کروں گا جو مقبول الہامی دینیات میں رائج ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا طریق کار لازماً سائنسی اور علمی ہے اور نتیجتاً ان اصطلاحات کے استعمال پر مجبور کرتا ہے جن کی تعبیر و تفسیر روزمرہ کے انسانی تجربے کی روشنی میں کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر جب میں یہ کہتا ہوں کہ مذہب کسی قوم کے افراد کی زندگی کے تجربات کا خلاصہ ہے جو کسی بڑی شخصیت کے واسطے سے مخصوص پیرایۂ اظہار سے مزین ہوا ہے تو میں دراصل سائنسی اور علمی زبان میں حقیقتِ الہام کا ترجمہ کرتا ہوں۔ اسی طرح انفرادی اور آفاقی قوت کا باہمی عمل دعا اور عبادت کے احساس کے لیے ایک اور تعبیر و اظہار ہے جس کا بیان سائنسی اور علمی مقاصد کے حصول کے لیے ازبس ضروری ہے، جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، میں اپنے موضوع کا محاسبہ مطلقاً انسانی نقطۂ نظر سے کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں مذاہب کی نہائی بنیاد کے طور پر خدائی الہام کی حقیقت کو شک کی نظر سے دیکھتا ہوں بلکہ مراد یہ ہے کہ میں نسبتاً زیادہ سائنسی اور علمی مضمون کی تعبیرات و اظہارات کے استعمال کو ترجیح دیتا ہوں۔ اسلام تمام مذاہب سے زیادہ کم سن یا نوخیز مذہب ہے اور انسانیت کی آخری تخلیق ہے۔ اس مذہب کا بانی ہمارے سامنے اظہر من الشمس ہے۔ وہ ایک تاریخی شخصیت ہے اور ہمہ گیر انتقاد کے لیے آمادہ نظر آتا ہے۔ اس کی صورت کے گرد اگرد مبہم افسانوں نے

پردے نہیں بنے ہیں۔ اس کا تولد تاریخ کی روشنی میں ہوا ہے۔ ہم اس کے اعمال کے باطنی سرچشمے کا بخوبی ادراک کر سکتے ہیں۔ ہم اس کے ذہن کو عمیق نفسیاتی تجزیے کا موضوع بنا سکتے ہیں۔ ان معروضات کی روشنی میں ہمیں چاہیے کہ مافوق الفطرت عناصر سے قطع نظر کریں اور اسلام کے ڈھانچے کو اس حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کریں جس حیثیت میں وہ ہم کو نظر آتا ہے۔

میں نے ابھی اس طریقے کی طرف اشارہ کیا ہے جس کے ذریعے مذہب کا منتقد طالب علم اپنے موضوع کا جائزہ لیتا ہے۔ اس مقالے میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ میں اسلام کے بارے میں ان تمام سوالات کے جوابات دوں جو مذہب کے ایک منتقد طالب علم کی حیثیت سے میرے ذہن میں ابھرتے ہیں اور جن کا جواب اس لیے ضروری ہے کہ اس مذہبی نظام کے حقیقی معنی منکشف ہو جائیں۔ میں اسلام کی اصل اور اس کے تدریجی نشو و نما کے بارے میں کوئی سوال نہیں اٹھاؤں گا، نہ میں فکر کی ان مختلف لہروں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کروں گا جو اسلام کے ظہور سے پہلے عربی معاشرے میں موجود تھیں اور جن کو آخری نقطۂ ماسکہ پیغمبر اسلام کے اقوال اور تقاریر میں ملا۔ میں اپنی توجہ کو اسلامی مطمح نظر کے صرف اخلاقی اور سیاسی پہلوؤں تک محدود رکھوں گا۔

سب سے پہلے ہم کو یہ امر تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر بڑا مذہبی نظام خاص مسائل سے شروع ہوتا ہے جن کا تعلق انسان اور کائنات سے ہے۔ مثال کے طور پر بدھ مت کا نفسیاتی پہلو انسانی درد کی مرکزی حقیقت ہے جو کائنات کے ڈھانچے میں غالب عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ بدھ مت کی تعلیمات کے مطابق انسان اپنی انفرادی حیثیت کے لحاظ سے روحانی درد اور ذہنی کوفت کے مقابلے میں بے بس اور لاچار ہے۔ انفرادی شعور اور درد کے درمیان ایک مستحکم تعلق ہے جو درد کے مستقل امکان کے علاوہ کچھ اور نہیں، درد سے آزاد ہونا دراصل انفرادیت سے آزاد ہونا ہے۔ بدھ مت انسان کے سامنے تخریب ذات کے مطمح نظر کو پیش کرنے کے سلسلے میں بالکل موافق نظر آتا ہے۔ اس رشتے یا تعلق کی دو اصطلاحوں یعنی درد اور احساس شخصیت میں سے ایک یعنی درد اصلی ہے اور دوسری محض دھوکا اور فریب ہے جس کے چنگل سے ہم خود کو نجات دے سکتے ہیں بشرطیکہ ہم عمل کے ان خطوط پر گامزن ہونے کو ترک کر دیں جن میں احساس شخصیت کو شدید سے شدید تر کرنے کا میلان موجود ہے۔ پس بدھ مت کے مطابق نجات عدم عمل یا عدم حرکت میں ہے اور ترک ذات اور دنیا سے بے تعلقی خاص اوصاف ہیں۔ اسی طرح مسیحیت مذہبی نظام کی حیثیت سے گناہ کی حقیقت پر مبنی ہے۔ اس مذہب میں دنیا کو بدی محسوب کیا جاتا ہے اور داغ گناہ کو انسان کے لیے موروثی شمار کیا جاتا

ہے۔ انسان انفرادیت کے لحاظ سے ناقص ہے۔ اسے کسی مافوق الفطرت شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے اور خالق کے درمیان واسطہ بن سکے۔ مسیحیت بدھ مت کے برعکس انسانی شخصیت کو حقیقی تصور کرتی ہے لہذا اس امر تک بدھ مت کے موافق نظر آتی ہے کہ انسان گناہ کی قوت کے مقابلے میں کمزور ہے، تاہم مجموعی طور پر ہلکا اور لطیف سا اختلاف ہے۔ مسیحیت کے مطابق ہم کسی منجی یا نجات دہندہ پر انحصار کرنے کے ذریعے گناہ سے نجات پا سکتے ہیں اور بدھ مت کے مطابق ہم اپنے آپ کو درد سے آزاد کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم اس ناکافی قوت کو فطرت کی آفاقی قدرت یا طاقت میں منتشر یا گم ہوجانے کا موقع دیں۔ دونوں مذاہب کوتاہی کی حقیقت پر متفق ہیں۔ اس امر پر بھی دونوں کا اتفاق ہے کہ کوتاہی ایک بدی ہے۔ دونوں میں فرق ہے تو یہ کہ ایک مذہب (مسیحیت) منجی یا نجات دہندہ کی شخصیت کی قوت کو بروئے کار لا کر اپنے نقص کا ازالہ کر لیتا ہے اور دوسرا مذہب (بدھ مت) اس نقص کو مکمل طور پر نیست و نابود کرنے کے لیے اس کی تدریجی تخفیف کی ہدایت کرتا ہے۔ جہاں تک زرتشتیت کا تعلق ہے تو یہ مذہب فطرت کو نیکی اور بدی کی قوتوں کے درمیان لامحدود کش مکش کے ایک منظر کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور انسان کو اتنا اختیار دیتا ہے کہ وہ عمل کے اس راستے کا انتخاب کرے جسے وہ پسند کرتا ہے۔ زرتشتیت کے مطابق کائنات کچھ شر ہے کچھ خیر ہے۔ انسان نہ تمام تر نیک ہے اور نہ مکمل طور پر بد ہے بلکہ دو اصولوں کا سنگم ہے اور یہ دو اصول عبارت ہیں نور و ظلمت سے۔ نور و ظلمت آفاقی برتری اور تفوق حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ مستقلاً برسر پیکار ہیں۔ پس کائنات اور انسان سے متعلق بنیادی پیش فرضیات بدھ مت، مسیحیت اور زرتشتیت میں علی الترتیب اس طرح ہیں:

۱۔ فطرت میں درد ہے اور انسان انفرادی طور پر بدی کا مجسمہ ہے۔ (بدھ مت)

۲۔ کائنات میں گناہ ہے اور گناہ کا داغ انسانیت کے لیے مہلک ہے۔ (مسیحیت)

۳۔ کائنات میں کش مکش اور جد و جہد ہے، انسان کش مکش اور جد و جہد کرنے والی قوتوں کا آمیزہ ہے۔ وہ خیر کی قوتوں کی طرف اپنے آپ کو صف بستہ کرنے میں آزاد ہے جو انجام کار غالب آئیں گی۔ (زرتشتیت)

اب سوال یہ ہے کہ کائنات اور انسان کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے؟ اسلام میں وہ کون سا مرکزی فکر یا خیال ہے جو تمام نظام کے ڈھانچے کو معین کرتا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ گناہ، درد اور غم مسلسل طور پر قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں۔ صداقت یہ ہے کہ اسلام کائنات کو حقیقت کے طور پر دیکھتا ہے اور

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کو حقیقت تصور کرتا ہے جو اس کے اندر موجود ہیں۔ گناہ، درد، غم، جدوجہد یقیناً حقیقی ہیں، لیکن اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ بدی یا شر کائنات کے لیے ضروری نہیں ہے۔ کائنات کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔ گناہ اور بدی یا شر کے عناصر کو آہستہ آہستہ نابود کیا جا سکتا ہے۔ جو کچھ کائنات کے اندر ہے وہ خدا کا ہے اور فطرت کی جو قوتیں بظاہر تخریبی نظر آتی ہیں وہ زندگی کا سرچشمہ بن جاتی ہیں بشرطیکہ انسان ان کو مناسب طریقے میں قابو میں رکھے۔ انسان کو ان قوتوں کے سمجھنے اور ان کو اپنے قابو میں رکھنے کی طاقت ودیعت کی گئی ہے۔

یہ اور اسی قسم کی دوسری قرآنی تعلیمات جو گناہ اور غم کی حقیقت کی قرآنی شناخت سے مربوط ہیں، ظاہر کرتی ہیں کہ کائنات کے بارے میں اسلامی فکر یا خیال نہ تو رجائیت پسندانہ ہے اور نہ قنوطیانہ۔ جدید نفس پیمائی نے بدھ مت کے نفسیاتی پہلوؤں کا آخری اور قطعی جواب دیا ہے۔ درد کائنات کے ڈھانچے میں ضروری جزو یا عنصر نہیں، اور قنوطیت محض مخالف اجتماعی ماحول کی پیداوار ہے۔ اسلام منظم عمل کی تاثیر میں یقین رکھتا ہے، لہٰذا اسلام کے نقطۂ نظر کو ترقی پسندانہ کہنا چاہیے اور اس سے مراد ہے آخری اور قطعی پیش فرضیہ اور سائنسی یا علمی دریافت اور اجتماعی ترقی کی سطح پر تمام انسانی جدوجہد کا جواز۔ اگرچہ اسلام فطرت میں درد، گناہ اور کشمکش یا جدوجہد کی حقیقت کو تسلیم کرتا ہے لیکن اسلام کے مطابق انسان کی اخلاقی ترقی کے راستے میں جو اصل حقیقت حائل ہوتی ہے وہ نہ درد ہے، نہ گناہ اور نہ کشمکش یا جدوجہد۔ یہ خوف ہے جس کا انسان شکار ہے اور شکار ہونے کا سبب یہ ہے کہ انسان خدا کی ذات میں کامل ایمان نہیں رکھتا اور اپنے ماحول کی فطرت سے غفلت برتتا ہے۔ انسان کو اخلاقی ترقی کا بلند ترین درجہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ خوف اور حزن سے مکمل طور پر نجات پا لیتا ہے۔

پس مرکزی قضیہ جو اسلام کے ڈھانچے کو منضبط کرتا ہے، یہ ہے کہ فطرت میں خوف موجود ہے اور اسلام کا مقصد انسان کو خوف سے نجات دلانا ہے۔ کائنات کے متعلق یہ نظریہ انسان کی مافوق الطبیعی فطرت کے اسلامی نظریے پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اگر خوف انسان پر حکومت کرتا اور اس کی اخلاقی ترقی میں مخل ہوتا ہے تو انسان کو قوت کی اعلیٰ اور ایک طاقت یعنی اللہ، لامتناہی قوت کا ایک سرچشمہ تسلیم کرنا چاہیے جس کی تدریجی تعمیر تمام انسانی عملیات کا مقصد ہونا چاہیے، لہٰذا انسان کی ضروری

فطرت ارادے پر مبنی ہے فہم یا فراست پر نہیں۔

انسان کی اخلاقی فطرت کے لحاظ سے بھی اسلام کی تعلیم دوسرے مذہبی نظاموں کی تعلیمات سے مختلف ہے اور جب خدا نے فرشتوں سے کہا "میں زمین پر اپنا نائب یا خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں، تو" انھوں نے عرض کیا: "کیا تو اس کو پیدا کر رہا ہے جو خوں ریز ہوگا اور زمین کے امن وامان کو درہم برہم کر دے گا، ہم تیری حمد وثنا کرتے ہیں اور تیری تعریفات کے گیت گاتے ہیں؟" خدا نے جواب دیا: "میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔" قرآن مجید کی اس آیت کو اگر اس مشہور روایت کی روشنی میں دیکھا جائے کہ ہر بچہ مسلمان اور امن پسند انسان کی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کے عقاید کی رو سے انسان لازمی طور پر نیک اور فطرتاً امن پسند ہے۔ جدید سیاسی فکر کے بانی "روسو" نے ہمارے زمانے میں اس عقیدے کی نہ صرف ترجمانی کی بلکہ پُرزور حمایت کی ہے۔ مخالف عقیدہ یعنی انسان کے فسق و فجور کا اصول، جس کی تبلیغ و اشاعت روم کے کلیسا نے کی ہے، سخت نقصان دہ مذہبی اور سیاسی نتائج کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ پس اگر انسان ترکیبِ عناصر کے لحاظ سے ضعیف اور کمزور ہے تو اس کو اپنی مرضی کے راستے پر گامزن ہونے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ اس کی تمام زندگی کسی خارجی طاقت کی نگرانی میں رہنی چاہیے۔ اس کا مطلب ہے مذہب میں پیشوائی اور سیاسیات میں مطلق العنانی یا حکومتِ استبداد۔ تاریخ یورپ میں قرونِ وسطیٰ نے روحانیت کے اس مذہبی عقیدے کو سیاسی اور مذہبی نتائج تک پہنچا دیا اور انجام کار ایک ایسے معاشرے نے جنم لیا جس کو تباہ کرنے اور اس کے ڈھانچے کے بنیادی پیش فرضیات کو درہم برہم کرنے کے لیے نہایت شدید انقلابات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لوتھر مذہب میں استبداد کا دشمن ہے اور روسو سیاسیات میں استبداد کا دشمن ہے۔ ان دونوں کو یورپی انسانیت کو پائی اور مطلق العنانی کی شدید قیود سے نجات دلانے والا تصور کرنا چاہیے، اور ان کے مذہبی اور سیاسی افکار و خیالات کو انسانی فسق و فجور کے کلیسائی عقیدے کی حقیقی تکذیب سمجھنا چاہیے۔ ارتقائی عمل سے گناہ اور درد کو نابود کرنے کا امکان اور انسان کی فطری خوبی میں ایمان اسلام کے بنیادی مسائل ہیں۔ یہی مسائل یورپ کی جدید تہذیب میں نظر آتے ہیں۔ اپنے اس مذہبی نظام کے باوجود جس کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے، اس نے لاشعوری طور پر ان مسائل کی صداقت کا اعتراف کر لیا ہے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو انسان فطری طور پر نیک اور امن پسند ہے۔ مافوق الطبعی زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو انسان طاقت کی ایک

وحدت یا اکائی ہے جو اپنے ماحول کی فطرت کی غلط فہمی کی وجہ سے اپنے خوابیدہ امکانات کا اظہار نہیں کر سکتی۔ اسلام کا اخلاقی مطمحِ نظر انسان کو خوف سے نجات دلانا ہے تاکہ وہ اپنی شخصیت کا احساس کر سکے اور اپنے متعلق اس حقیقت کا ادراک کر سکے کہ وہ طاقت کا ایک سرچشمہ ہے۔ انسان کے بارے میں یہ عقیدہ کہ وہ اپنی انفرادیت کے لحاظ سے لامتناہی طاقت کا حامل ہے، اسلام کی تعلیمات کے مطابق تمام انسانی عملیات کی قدر و قیمت کو معین کرتا ہے۔ جو چیز انسان کے اندر انفرادیت کے احساس کو شدید سے شدید تر بناتی ہے وہ نیکی یا خیر ہے اور جو چیز اس احساس کو کمزور یا ضعیف کرتی ہے وہ بدی یا شر ہے۔ نیکی یا خیر قدرت، قوت اور طاقت ہے اور بدی یا شر کمزوری اور ضعف ہے۔ اگر انسان کو اپنی شخصیت کے احترام کا شدید احساس یا شعور دیا جائے اور اس کو آزادی اور بے خوفی کے ساتھ خدا کی زمین کی عظیم وسعت میں نقل و حرکت کا موقع مہیا کیا جائے تو وہ دوسروں کی شخصیتوں کا احترام کرے گا اور مکمل طور پر نیکی یا خیر کا مجسمہ بن جائے گا۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ اس مختصر سے مقالے میں اس امر کی تفصیل بیان کروں کہ کس طرح گناہ کی تمام بڑی صورتوں کو تحلیل کر کے خوف کے مرحلے میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن اب ہم اس علت اور محبت کو دریافت کریں گے کہ کیوں انسانی عمل کی بعض صورتیں مثلاً ترکِ ذات، غربت، غلامانہ اطاعت یا فرماں برداری جو کبھی کبھی اپنے آپ کو عجز و انکسار اور ترکِ علائق یا روحانیت کے خوب صورت ناموں میں چھپا لیتی ہیں ــ یعنی عمل کے وہ انداز جو انسانی شخصیت کی قوت کو کمزور اور ضعیف بنانے کا باعث ہوتے ہیں ــ بدھ مت اور مسیحیت میں نیکی اور خیر کا مجموعہ تصور کی جاتی ہیں اور اسلام میں ان کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جب کہ قدیم عیسائیوں نے غربت یا افلاس اور ترکِ علائق یا روحانیت میں خود کو عظمت و تہلیل بخشتی ہے، اسلام غربت یا افلاس کو گناہ کی نظر سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے: "تم دنیا میں اپنے حصے کو فراموش نہ کرو۔" اسلام کے نقطۂ نظر سے سب سے بڑی خوبی وہ نیکی ہے جس کی تعریف قرآن نے مندرجہ ذیل انداز میں کی ہے۔

"یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم نماز پڑھتے وقت اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو، نیکی درحقیقت اس شخص کے لیے مسلّم ہے جو خدا، روزِ قیامت، فرشتوں، صحفِ انبیا اور پیغمبروں میں ایمان رکھتا ہے۔ وہ لوگ نیک کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں جو خدا کی راہ میں اپنے عزیزوں، یتیموں، ضرورت مندوں، مسافروں اور ان لوگوں پر جو پیسے کے طالب ہوتے ہیں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ وہ لوگ بھی نیک ہیں جو غلاموں کو

آزاد کراتے ہیں۔ ان لوگوں کی مدد کرتے ہیں جو مستقلاً عبادت کرتے ہیں، اور ان اشخاص کا سہارا بنتے ہیں جو اپنے وعدوں کو ہر قیمت پر وفا کرتے ہیں اور مصیبت اور سختی کے وقت صبر و تحمل کا اظہار کرتے ہیں۔"

پس یہ ظاہر ہے کہ اسلام قدیم دنیا کی اخلاقی اقدار کی قلبِ ماہیت کرتا ہے، اور انسانی شخصیت کے احساس کی شدت اور حفاظت کو تمام اخلاقی عملیات کی قطعی بنیاد قرار دیتا ہے۔ انسان ایک ذمے دار ہستی ہے، وہ اپنی قسمت کو خود بناتا ہے۔ اپنی نجات کے لیے کوشش کرنا اس کا اپنا معاملہ ہے۔ انسان اور خدا کے درمیان کوئی ثالث نہیں ہے۔ خدا پر انسان کا پیدائشی حق ہے، لہٰذا جب قرآن مجید عیسیٰ علیہ السلام کو روحِ خداوندی کی حیثیت سے دیکھتا ہے تو نجات کے مسیحی عقیدے پر سختی سے اعتراض کرتا ہے، اسی طرح اس عقیدے کی بھی مذمت اور تقبیح کرتا ہے کہ کلیسا میں ایک معصوم مربی سردار ہوتا ہے۔ یہ وہ عقائد ہیں جو انسانی شخصیت کی کوتاہی یا نقص کے تصور کی نشاندہی کرتے ہیں اور انسان میں ایک طرح کا احساسِ دست نگری پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ روش اسلام میں ایک ایسی قوت سمجھی جاتی ہے جو انسان کی اخلاقی ترقی میں مزاحم ہوتی ہے۔ قانون اسلام لاقانونیت کو تسلیم کرنے میں مذہب ~~کو کوئی دیتا ہے~~ اس کا سبب یہ ہے کہ لاقانونیت کا داغ دراصل انسان کی آزادی کے صحت مندانہ ارتقا کے لیے ایک زبردست اور کاری ضرب ہے۔ اسی طرح قانونِ اسلام اس امر کا حامی نظر آتا ہے کہ جب کوئی بچہ پندرہ سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو وہ مطلقاً آزاد انسانی ہستی ہوتا ہے۔ یہ بات قانون اسلام میں اس لیے منضبط کی گئی ہے کہ انسان کو جلد از جلد احساس یا شعورِ شخصیت حاصل ہو جائے۔

اسلامی اخلاقیات کے اس عقیدے پر البتہ ایک اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔ اگر انسان کی شخصیت کا ارتقا اسلام کا سب سے بڑا مقصد ہے تو کیوں یہ مذہب غلامی کے قانون یا رواج کو برداشت کرتا ہے آزادانہ طور پر مشقت اور محنت کرنے کا عقیدہ قدیم دنیا کے اقتصادی احساس یا شعور کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ ارسطو اس عقیدے کو انسانی معاشرے کے لیے ایک ضروری جزو قرار دیتا ہے۔ پیغمبر اسلام نے جو خدا اور قدیم دنیاؤں کے درمیان واسطہ ہونے کے سبب سے مساوات کے اصول کا اعلان کیا اور اگرچہ آپ نے ہر عقل مند مصلح کی طرح غلامی کے نام کو برقرار رکھنے میں اپنے ماحول کے اجتماعی اور معاشرتی حالات سے کسی حد تک سمجھوتہ کیا لیکن آہستہ آہستہ اس آئین کی تمام روح کو نابود کر دیا۔ اسلام میں غلاموں کو عام مسلمانوں کے برابر حقوق دیے جاتے ہیں، اس امر کی تصدیق اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ اسلام کے بعض سپاہ

ادشاہ، وزیر، دانشمند اور قانون دان وغیرہم غلام تھے۔ ابتدائی خلفا کے زمانے میں زرخرید غلامی کا رواج نہیں تھا۔ لوگوں کو غلامی سے نجات دلانے کے مقاصد کے لیے بیت المال کا کچھ حصہ دے دیا جاتا تھا اور جنگی قیدیوں کو یا تو ویسے ہی چھوڑ دیا جاتا تھا یا فدیے کی ادائیگی پر رہا کر دیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کی تسخیر کے بعد تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا تھا۔ غلاموں کو قابلِ گرفت اور لائق مؤاخذہ قتل کے جرمانے کے طور اور غلطی سے جھوٹی قسم کھانے کا کفارہ دینے کی غرض سے بھی آزاد کیا جاتا تھا۔ غلاموں کے ساتھ پیغمبر اسلام کا سلوک غیر معمولی طور پر رحم دلانہ تھا۔ مغرور اشرافی عرب غلاموں کی اجتماعی اور معاشری ترقی کو ان کے آزاد ہونے کے بعد بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ مکمل مساوات کے جمہوری مطمح نظر کو جسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے دوران بہت زیادہ غیر مصالحانہ اظہار کا موقع ملا، انتہا پسند اشرافی لوگوں کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے بہ شرطیکہ صورتِ حال کو بڑی احتیاط کے ساتھ قابو میں کر لیا جائے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قریشی عورت کی جو اُن کے رشتہ داروں میں سے تھی، ایک رہا شدہ غلام کے ساتھ شادی کی۔ یہ شادی ایک آزاد عرب عورت کے اشرافی غرور کے لیے ضرب کاری ثابت ہوئی۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ زندگی بسر نہ کر سکی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو طلاق ہو گئی۔ طلاق نے اس کو مجبور، بے بس اور لاچار بنا دیا، کیوں کہ کوئی بھی محترم عرب ایک غلام کی مطلقہ بیوی کے ساتھ شادی کرنے کو تیار نہ تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حالات سے باخبر تھے، اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اس کو اجتماعی اور معاشری اصلاح کا وسیلہ بنایا۔ آپؐ نے خود اس عورت سے شادی کر لی، اور اس طرح یہ ثابت کر دیا کہ نہ صرف ایک غلام آزاد عورت سے شادی کر سکتا ہے بلکہ اس کی مطلقہ بیوی بھی دوبارہ معزز اور محترم گھرانے میں شادی کر سکتی ہے حتیٰ کہ پیغمبر خداؐ کی بیوی بن سکتی ہے۔ عرب کی اجتماعی اور معاشری اصلاح کی تاریخ میں اس شادی کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس امر کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ کیا اس شادی کی اصل حقیقت کو سمجھنے میں اسلام کے یورپی نقادوں نے تعصب، غفلت اور کم نظری کا ثبوت دیا ہے۔

غلاموں سے جدید مسلمانوں کے برتاؤ کو ظاہر کرنے کی غرض سے میں افغانستان کے امیر عبدالرحمن (مرحوم) کی سوانح عمری کے انگریزی ترجمے سے ایک اقتباس ذیل میں درج کرتا ہوں۔

امیر کہتا ہے، "مثال کے طور پر فرامرز خان ہے جو ایک چترالی غلام ہے، وہ ہرات میں میرا قابل اعتماد

کمانڈر ان چیف ہے۔ نذیر محمد معز خان ایک اور چترالی غلام ہے۔ وہ میرے دربار کا معتمد ترین عہدے دار ہے، میری مہر اس کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ اس مہر کو سرکاری دستاویزات اور میرے کھانے پینے پر لگاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسے میری زندگی کا پورا اعتماد حاصل ہے اور میری سلطنت اس کے ہاتھوں میں ہے۔ پسوار خان مرحوم، ڈپٹی کمانڈر ان چیف اور جان محمد خان، افسر خزانہ دونوں اپنی زندگی میں حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر متمکن تھے اور دونوں ہی میرے غلام تھے۔"

سچ تو یہ ہے کہ غلامی کا آئین یا رسم اسلام میں محض نام کے طور پر ہے اور شخصیت کو برقرار رکھنے کا عقیدہ اسلام کے قانون اور اخلاقیات کے سارے نظام میں اصولِ راہنما کے طور پر نظر آتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ایک قوی ارادہ ایک قوی جسم میں اسلام کا اخلاقی مطمح نظر ہے، لیکن یہاں مجھے ایک لمحے کے لیے رک جانے دیں اور یہ دیکھنے دیں کہ آیا ہم ہندوستان کے مسلمان اس مطمح نظر پر پورے اُترتے ہیں؟ کیا مسلمان ایک مضبوط یا قوی ارادہ مضبوط یا قوی جسم میں رکھتے ہیں؟ کیا ان میں زندہ رہنے کی خواہش ہے؟ کیا ہندوستانی مسلمان میں کردار کی اتنی قوت ہے کہ وہ ان قوتوں کی مخالفت کر سکے جو اس اجتماعی اور معاشری نظام کو منتشر کرنے کی کوشش کرتی ہیں جس سے اس کا تعلق ہے؟ مجھے افسوس ہے کہ میرے ان سوالات کا جواب نفی میں ہے۔ قارئین جانتے ہیں کہ زندہ رہنے کی سخت جدوجہد میں عدد، شمار یا تعداد کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس کے ذریعے اجتماعی یا معاشری نظام باقی نہیں رہتا۔ کردار انسان کا بنیادی ہتھیار ہے۔ یہ ہتھیار نہ صرف ان کوششوں میں اس کا ساتھ دیتا ہے جو وہ معاندانہ فطری ماحول کے خلاف کرتا ہے بلکہ اس مقابلے میں بھی اس کی مدد کرتا ہے جو اس کے عزیز مریضوں کے ساتھ صورت پذیر ہوتا ہے تاکہ وہ بھرپور، اچھی اور بہتر زندگی حاصل کر سکے۔ ہندوستانی مسلمان کی قوتِ زندگی دردانگیز طور پر کمزور ہو گئی ہے۔ مذہبی روح کے زوال نے جس میں سیاسی قسم کے اور عوامل بھی شامل ہیں جن پر اس کو کوئی اختیار نہیں ہے اس کے اندر خود کو چھوٹا محسوس کرنے کی عادت اور دوسروں پر انحصار کرنے کا شعور پیدا کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں روح کی سستی پیدا ہو گئی ہے جسے کمزور لوگ "قناعت" کے مقتدر اور معزز نام سے پکارتے ہیں اور جس کے پردے میں اپنی کمزوری کو چھپاتے ہیں۔ اپنے غیر جانب دارانہ تجارتی حسنِ عمل کی وجہ سے وہ اقتصادی اور معاشی مہم میں ناکام ہو گیا ہے۔ ملی مفاد کا صحیح تصور نہ رکھنے اور اس ملک کی دوسری اقوام کے مقابلے میں اپنی قوم یا ملت کی موجودہ حالت کا بجا طور پر ادراک نہ کرنے کے باعث وہ انفرادی امد

جتا می طور پر ان خطوط پر گامزن ہے جو اس کو تباہی اور بربادی کی طرف لے جائیں گے۔ اکثر دیکھنے میں تا ہے کہ وہ اپنے مقصد کی وکالت یا حمایت کرنے میں کوتاہی کا اظہار کرتا ہے اور یہ مقصد وہ ہے جس ی حقیقت مصدقاً قومی اور ملی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ماحول سے الگ رہتا ہے اور اس کا یہ مل بارسوخ اور ذی اثر ہندو کی خوشنودی کا سبب بنتا ہے جس کے وسیلے سے وہ شخصی اور ذاتی تخصص ور امتیاز حاصل کرنے کی امید کرتا ہے۔ میں بغیر تذبذب اور ہچکچاہٹ کے بیان کرتا ہوں کہ میرے دل یں اس ناخواندہ اور جاہل دکان دار کے لیے زیادہ احترام ہے جو اپنے بازوؤں میں اتنی طاقت رکھتا ہے کہ س کے ذریعے حلال روزی کما سکے اور مصیبت کے وقت اپنے بیوی بچوں کا دفاع کر سکے نہ نسبت اس دانشمند گریجویٹ کے جس کی کمزور، نرم اور دھیمی آواز اس کے جسم میں تنومند روح کے فقدان کی علامت ہے، جو اپنی اطاعت اور فرماں برداری پر نازاں ہے، بہت تھوڑا کھاتا ہے، اپنی بے خواب راتوں کا گلہ کرتا ہے، اور اپنی قوم یا ملت کے لیے کمزور اور بیمار بچے پیدا کرتا ہے، اگر وہ ایسا کرنے پر قادر ہو۔ مجھے امید ہے کہ قارئین میری یہ بات سن کر برافروختہ نہیں ہوں گے کہ میرے دل میں شیطان کے لیے ایک خاص حد تک قدر و منزلت ہے۔ آدم کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے، جس کو وہ اپنے سے چھوٹا سمجھتا تھا، اس نے اپنی عزت آپ کرنے اور کردار کی عظمت کا ایک بلند احساس یا شعور ظاہر کیا ہے جو میری رائے میں اس کو روحانی عیب سے مبرا کر سکتا ہے بعینہٖ جیسے مینڈک کی خوب صورت آنکھوں نے مینڈک کو اس کے جسمانی گھناؤنے پن سے نجات دلا دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ خدا نے اس کو اس لیے سزا نہیں دی کہ وہ ایک کمزور انسانیت کے جدِ امجد کے آگے سر جھکانے سے منکر ہوا بلکہ سزا اس کو اس بات کی دی گئی ہے کہ اس نے کائنات کے مطلق العنان اور زبردست فرماں روا کی مطلق اطاعت سے انحراف کیا۔ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مطمح نظر زیادہ تر ملازمت ہے اور ملازمت سے ایک ایسے ملک میں جیسا ہندوستان ہے ایک ایسا احساس پیدا ہو جاتا ہے جو انسانی شخصیت کی قوت کو کمزور اور ضعیف بنا دیتا ہے۔ جو لوگ ہم میں غریب اور مفلس ہیں ان کے پاس سرمایہ نہیں، متوسط طبقے کے لوگ ایک دوسرے پر اعتماد نہ کرنے کے باعث مشترکہ اقتصادی اور معاشی مہم میں حصہ نہیں لیتے اور جو متمول لوگ ہیں وہ تجارت کو اپنے وقار سے پست تر چیز تصور کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اقتصادی اور معاشی انحصار بدی اور گناہ کی تمام صورتوں کے لیے بچہ خیز یا بار آور ماں ہے۔ ہندوستانی مسلم کی برائیاں، عیب اور گناہ اس امر کو ظاہر کرتے ہیں کہ اس [illegible] حد تک کر دیا ہے۔

جسمانی طور پر بھی اس میں خوف ناک انحطاط پیدا ہو گیا ہے۔ اگر کوئی شخص سکولوں اور کالجوں میں مسلمان لڑکوں کے زرد، مرجھائے ہوئے اور مدقوق چہرے دیکھے تو اسے میرے بیان کی تکلیف دہ تصدیق کا احساس ہو جائے گا۔ طاقت، قدرت، توانائی، قوت — ہاں قوتِ جسمانی — زندگی کا قانون ہے۔ ایک طاقت ور انسان کی جب جیب خالی ہوتی ہے تو وہ دوسروں کو لوٹ لیتا ہے۔ اس کے برعکس ایک کمزور انسان کس مپرسی کی موت مر جاتا ہے۔ یہ موت دنیا کے مسلسل، رواں دواں جنگ و جدل کے دہشت ناک منظر میں واقع ہوتی ہے، لیکن کس طرح اس غیر مطلوبہ صورتِ حال کو بہتر بنایا جا سکتا ہے؟ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ تعلیم مطلوبہ قلبِ ماہیت کا کام انجام دے سکتی ہے، لیکن میں بلا جھجک کہوں گا کہ میں تعلیم کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ وہ اخلاقی تربیت کا وسیلہ بن سکے۔ میری مراد تعلیم سے وہ تعلیم ہے جو اس ملک میں رائج ہے۔ انسانیت کی اخلاقی تربیت کا کام حقیقت میں بڑی شخصیتوں سے وابستہ ہے جو وقتاً فوقتاً انسانی تاریخ کے راستے میں رونما ہوتی ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارا موجودہ اجتماعی اور معاشرتی ماحول ایسی اخلاقی مقناطیسیت رکھنے والی شخصیتوں کی پیدائش اور نشوونما کے لیے سازگار نہیں ہے۔ اگر ایسی شخصیتوں کی قلت کا سبب دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو ان تمام مرئی اور غیر مرئی قوتوں کا ہلکا اور لطیف سا تجزیہ کرنا پڑ جائے گا جو اس وقت ہمارے اجتماعی اور معاشرتی ارتقا کا راستہ معین کر رہی ہیں۔ یہ ایک ایسی تفتیش اور تحقیق ہوگی جس کو میں اس مقالے میں درج نہیں کر سکتا، لیکن تمام غیر جانب دار لوگ آسانی کے ساتھ اس امر کا اعتراف کریں گے کہ ایسی شخصیتیں اب ہم میں شاذ و نادر ہی رونما ہوتی ہیں جب صورتِ حال یہ ہو تو تعلیم ہی وہ چیز ہے جس کی طرف ہمیں رجوع کرنا ہوگا، لیکن تعلیم کس قسم کی ہونی چاہیے؟ تعلیم میں کوئی قطعی اور حتمی صداقت موجود نہیں ہے۔ یہی بات فلسفے اور سائنس میں دکھائی دیتی ہے۔ تعلیم برائے تعلیم احمقوں کا قول ہے۔ کیا ہمیں ایسا کوئی آدمی نظر آتا ہے جس کا ذہن نیوٹن کے نظریۂ تموج کی آماجگاہ ہو محض اس بنا پر کہ یہ سائنس کی ایک حقیقت ہے؟ تعلیم کو دوسری چیزوں کی طرح طالب علم کی احتیاجات اور ضرورتوں کے مطابق معین کیا جانا چاہیے۔ تعلیم کی وہ قسم جو اس خاص نوعیت کے کردار کی، جسے ہم اپنے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں، تشکیل نہ کر سکے تو وہ بالکل بے سود ہے اور کسی قدر و قیمت کی حامل نہیں۔ (باقی آئندہ)